OPEN ACCESS
Al-Qamar
ISSN (Online): 2664-4398
ISSN (Print): 2664-438X
www.alqamarjournal.com

قرآنی قصص میں علم بیان کی معنویت: آدم، ہود، اور صالح علیہم السلام کے قصص کا تجزیاتی مطالعہ

The Rhetorical Significance in Quranic Narratives: Analyzing the Stories of Prophets Adam, Hud, and Salih

Dr. Hajira Mariam
Lecturer, Lahore College for Women University, Lahore
Salma Jabeen
Subject Specialist, AFAQ Association for Academic Quality, Lahore
Sara Fatima
MPhil in Islamic Studies

Abstract

The rhetorical aspect of the Holy Quran is dominated in conveying its message. The Quran presents its teaching in various forms and one of its distinctive features is to narrate stories. People are always attracted towards stories as they learn life lessons from them. The Quran also uses this method and engages its reader by narrating historical incidences of different prophets and nations. These stories definitely provide different lessons to the reader which are important for the character building of an individual. Besides this, another characteristic of the Quranic narrations is uniqueness in its eloquence, literary and linguistic style. This article aims to discuss the rhetorical features of the Quranic stories in depth. The Quranic linguistic miracles encompass similes, metaphors, lexical cohesion, tropes, appropriate usage of different expressions, synonyms and antonyms, pragmatic coherence, repetition of words and thematic

CC BY

sequence etc. An individual can observe that linguistic excellence is prominent in the Quranic narrations. This article sheds light on some of the aspects of *ilm al bayan* in the stories and this demonstrates the miraculous nature of the Quranic Discourse. It proves that the miracle of the Quran is inimitable as no one succeeded to accept the challenge of producing something like Divine Word which possesses clarity of message and eloquence simultaneously.

Key Words: Quran, stories, Rhetorical, lessons, eloquence

تمہید

قرآن مجید سراسر معجزہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کلام ہونے کے سبب جن و بشر سمیت کوئی مخلوق اس جیسا کلام پیش نہیں کر سکتی۔ اس کے زمانۂ نزول میں مخالفین نے اس کی تاثیر کی وجہ سے کبھی قرآن کو جادو کہا، کبھی کہانت اور شاعری قرار دیا۔ لیکن ضد اور ہٹ دھرمی میں اسے اللہ سبحانہ کا کلام ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پر اللہ عزوجل نے انہیں چیلنج دیا کہ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ کوئی انسانی کلام ہے تو تم بھی عربی زبان کے ماہر ہو، اپنے دعوے کو سچا ثابت کرنے کے لیے قرآن جیسی کوئی ایک سورت، یا دس سورتیں، یا پورا قرآن پیش کر کے دکھا دو ورنہ تمھارا دعویٰ غلط ہے۔ لیکن کفارِ مکہ اس چیلنج کا جواب دینے سے قاصر رہے۔
قرآن حکیم اپنی زبان، بیان، فصاحت و بلاغت اور اثر انگیزی ہر اعتبار سے معجزہ مانا گیا ہے۔ قصص میں جہاں اور قابلِ ذکر پہلو مضمر ہوتے ہیں، وہاں اس میں فصاحت و بلاغت کی خوبیاں اور محاسن بھی پائے جاتے ہیں۔ 'علمِ بیان' جو دراصل علمِ معانی کی ایک فرع ہے، اس کی تعریف '**البلاغة العربية**' میں ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

"تعريف علم البيان: هو علم يبحث في كيفيات تأدية المعنى الواحد بطرق تختلف في وضوح دلالاتها، و تختلف في صورها و أشكالها وما تتصف به من إبداع و جمال، أو قبح و ابتذال."[1] **علم البیان کی تعریف: یہ ایسا علم ہے جس میں ان حالتوں پر بحث کی جاتی ہے جن میں کسی ایک ہی معنی کو واضح کرنے کے لیے اسے مختلف طریقوں سے ادا کیا جاتا ہے۔ اس میں صورتیں اور شکلیں تو الگ ہوتی ہیں لیکن ان میں کسی بات کی خاص خوبی یا خامی کو نمایاں کیا جاتا ہے۔**

گویا اس تعریف سے علم البیان کا جو مفہوم معلوم ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس علم میں ایک ہی مضمون کو مختلف طریقوں اور اسالیب میں اس طرح بیان کیا جاتا ہے، جس سے وہ بات کھل کر سامنے آتی ہے۔ اور سمجھنے والے کے لیے کوئی پیچیدگی یا ابہام باقی نہیں رہتا ہے۔ علم البیان کا تعلق ویسے تو تمام امور سے ہے لیکن قصص اور واقعات میں بھی اس کا استعمال پایا جاتا ہے۔

ا) قصہ آدم علیہ السلام و ابلیس

قرآن میں قصۂ آدمؑ و ابلیس کئی جگہوں پر آیا ہے۔ اس قصے کو بیان کرنے میں جہاں زبان و بیان کی دوسری خوبیاں پائی جاتی ہیں، وہاں ایک خوبی اس میں علم البیان کی بھی ہے جس سے اس کی افادیت، معنویت اور تاثیر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ذیل کی مثالوں سے یہ حقیقت نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

"فسجد الملائكة كلهم أجمعون" میں بلاغت

تمام فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم پر آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا۔ سورت الحجر میں فرمایا گیا **فسجد الملائكة كلّهم اجمعون**[2] (چنانچہ سارے فرشتوں نے سجدہ کیا۔)۔ اس مقام پر **فسجد الملائكة كلّهم** کہنا کافی تھا، مگر اس میں یہ احتمال پایا جاتا تھا کہ شاید صرف اکثریت مراد ہے لیکن '**اجمعون**' کے لفظ نے اس احتمال کو زائل کر دیا اور واضح کر دیا کہ سب فرشتوں نے سجدہ کیا تھا اور کوئی ایک فرشتہ ایسا نہ تھا جس نے سجدہ نہ کیا ہو۔ اس طرح تمام فرشتوں کے سجدہ کرنے کی حقیقت ظاہر ہو گئی اور یہی کلام کا مقصود تھا۔

الفاظ کا تنوع

حضرت آدم علیہ السلام کے قصے میں ابلیس کے عذر کا ذکر آیا ہے جو اُس نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے کے لیے تراشا تھا۔ قرآن نے اُسے مختلف الفاظ میں الگ الگ مقامات پر بیان کیا ہے جو اس کی فصاحت و بلاغت ہے کہ ایک ہی مضمون کو موقع و محل کی مناسبت سے جداگانہ انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ سورۃ الاعراف میں فرمانِ الٰہی ہے۔ **ما منعک ألا تسجد إذ أمرتک قال أنا خير منه خلقتني من نار و خلقته من طينo قال فاهبط منها فما يكون لک أن تتكبر فيها فاخرج إنک من الصاغرينo**[3] (فرمایا کہ جب میں نے تجھے حکم دیا تو تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا؟ بولا میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے پیدا کیا۔ ارشاد ہوا کہ یہاں سے نیچے اتر جا کیونکہ یہ تیرے لیے مناسب نہیں کہ تو یہاں رہ کر تکبر کرے۔ پس نکل جا، یقیناً تو ذلیلوں میں سے ہے) ۔ اس مضمون کو سورۃ الحجر میں یوں بیان کیا گیا ہے۔ **قال يا إبليس ما لک ألا تكون مع الساجدينo قال لم أكن لأسجد لبشر خلقته من صلصال من حمأ مسنونo قال فاخرج منها فإنک رجيمo**[4] (فرمایا اسے ابلیس! تجھے کیا ہوا کہ تو سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔ ابلیس بولا: میں انسان کے آگے جھکنے کو تیار نہیں جسے تو نے خمیر اٹھے ہوئے گارے کی سوکھی مٹی سے بنایا ہے۔ اللہ نے حکم دیا، تو یہاں سے نکل جا، تو مردود ہے) ۔ اس کا ذکر سورۃ ص میں بھی ہے۔ ان آیات کے علاوہ بھی آدم علیہ السلام کے واقعے میں الفاظ کا تنوع پایا جاتا ہے۔ طائرانہ نگاہ سے اس قصے کو پڑھا جائے تو یہ تکرار نظر آتا ہے لیکن اسے محض تکرار کہنا سراسر غلط ہے بلکہ یہ تصریف کا اسلوب ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی سوال کیا جاتا ہے کہ اگر یہ ایک ہی قصہ ہے تو اس میں اختلاف کیوں پایا جاتا ہے جیسا کہ ابلیس کی بات کو جسے قرآن نے بیان کیا ہے اس میں تضاد ہے۔ اس ضمن میں یہ نکتہ اہم ہے کہ عموماً قرآن میں ایک جگہ اجمال و اختصار ہوتا ہے اور دوسری طرف تفصیل ہوتی ہے۔ لہٰذا اس تفصیل کو تضاد یا اختلاف کہنا غلط ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ماضی کے کسی قصے کو بیان کرنے کے لیے اس کے اصل الفاظ بیان کرنا ضروری نہیں ہوتا، کیونکہ مقصد صرف اس کے معنی ہوتے ہیں۔ جب معنی ایک جیسے ہوں تو الفاظ کے اختلاف سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

'و' اور 'ف' کے حروف کا استعمال

حضرت آدم علیہ السلام کے قصے میں سورۃ البقرۃ میں آیا ہے **و قلنا یا آدم اسکن انت و زوجک الجنۃ وکلا منہا رغدا حیث شئتما**[5] اور دوسری جگہ سورۃ الاعراف میں ہے کہ **و یا آدم اسکن انت و زوجک الجنۃ فکلا من حیث شئتما**[6]. اس طرح پہلی آیت میں '**وقلنا**'، '**وکلا**' اور '**رغدا**' کے الفاظ آئے ہیں جو دوسری آیت میں نہیں آئے بلکہ اس میں '**فکلا**' آیا ہے۔ اس فرق کو علم بیان کی روشنی میں '**الأصلان فی علوم القرآن**' میں اس طرح واضح کیا گیا ہے۔

> "**و من ذلک قوله في سورة البقرة: (و قلنا يا آدم اسكن أنت و زوجك الجنة و كلا منها رغدا حيث شئتما) و في سورة الاعراف: (و يا آدم اسكن أنت و زوجك الجنة فكلا من حيث شئتما) فالفوارق في الموضعين: 'قلنا' و 'الواو' و 'رغدا' هذا في البقرة... لأنها مسبوقة بقول الله: (إني جاعل في الأرض خليفة) و قوله للملائكة: (اسجدوا لآدم) والسكنى في البقرة مراد بها الإقامة، فناسبها الواو الدالة على الامتنان، و لذا قال: (رغدا) أما في الأعراف، فلم يتقدم قول سابق. والسكنى فيها اتخاذ المسكن، والمناسب لها الفاء، لأن الأكل مرتب على اتخاذ المسكن.**"[7] اور ارشادِ باری تعالیٰ جو کہ سورۃ البقرۃ میں ہے۔ پھر ہم نے آدم سے کہا: تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو اور اس میں سے جہاں سے چاہو، خوب مزے سے کھاؤ پیو اور سورۃ الاعراف میں ہے۔ اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور کھاؤ پیو جہاں سے چاہو۔ پس دونوں جگہوں پر جو فرق ہے، وہ ہے '**قلنا**' اور '**الواو**' اور '**رغدا**'۔ یہ سورۃ بقرہ میں اس لیے ہے کہ اس سے پہلے یہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ بے شک میں زمین پر خلیفہ بنانے والا ہوں۔ اور فرشتوں کے لیے اُن کا ارشاد: تم سب آدم کو سجدہ کرو اور سورۃ البقرۃ میں '**سکنیٰ**' سے مراد اقامت ہے۔ چنانچہ ممانعت پر دلالت کرنے والا **واؤ** وہاں پر مناسب تھا اور اسی لیے کہا: '**رغدا**'۔ جبکہ سورہ الاعراف وہ بات اس سے پہلے نہیں آئی جو سورہ بقرہ میں تھی۔ اور '**سکنیٰ**' یہاں پر بمعنی سکونت اختیار کرنے کے ہیں۔ لہٰذا اس کے لیے '**ف**' مناسب تھا۔ اس لیے کہ کھانا ٹھکانے پر پہنچنے کے بعد ہوتا ہے۔

عربی زبان میں 'وا' ور 'ف' حروف کے استعمال کا جو فرق پایا جاتا تھا، قرآن نے اسے پوری طرح ملحوظ رکھا ہے جو اس کی بلاغت کی نشانی ہے ورنہ کلام ان حروف کے غلط استعمال سے بلاغت کے مقام سے گر جاتا۔ سورۃ البقرۃ میں **وکلا** کے الفاظ آدم علیہ السلام کے خلیفہ بنائے جانے کا ذکر کرنے کے بعد آئے ہیں۔ اس مقام پر خلافت کی بات اور جنت میں رہنے کی بات مذکور ہے ا ور یہ دونوں الگ باتیں تھیں۔ گویا ایک بات کے بعد دوسری بات آئی تو اس کی ترتیب کے لیے اور اسے ملانے کے لیے 'و 'عطف کے طور پر آیا۔ اس میں **اسکن** سے مراد رہائش اختیار کرنا ہے۔ لیکن سورۃ الاعراف میں آدم علیہ السلام کے خلیفہ بنائے جانے کا ذکر نہیں آیا، اس میں رہائش اختیار کرنے کا ذکر ہے۔ ادھر کھانے پینے کے بعد سکونت اختیار کرنے کے مرحلے کے لیے '**ف**' کا استعمال کیا گیا۔

لفظ 'اھبطوا' کا اعادہ

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام کو دو بار **اھبطوا** (تم اترو) کا حکم دیا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں پہلے فرمایا **وقلنا اهبطوا بعضكم لبعض عدو و لكم في الارض مستقر و متاع الى حين**[8] (اور ہم نے حکم دیا: "تم سب یہاں سے اتر جاؤ، تم دونوں فریق ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ تمھیں دنیا میں ایک مدت تک رہنا اور فائدہ اُٹھانا ہے)۔ بعد ازاں حکم دیا گیا **قلنا اهبطوا منهاجميعا**[9] (اور ہم نے حکم دیا: "تم سب یہاں سے اتر جاؤ)۔ بظاہر **اھبطوا** کا لفظ تکرار ہے مگر یہ دو الگ الگ حکم ہیں اور ان میں تکرار نہیں ہے جو کہ کلام کا عیب ہوتا ہے بلکہ یہ علم بیان کی بلاغت ہے۔ جب آدمؑ اور حواؑ سے لغزش ہوئی تو ان کو '**ھبوط**' یعنی اُترنے کا حکم دیا گیا۔ یہ حکم ان کی غلطی کی سزا کو ظاہر کرتا ہے جس پر انہوں نے توبہ کر لی۔ دوسری بار اترنے کا حکم دیا تو وہ اس وعدے کے مطابق تھا جو پہلے کیا گیا تھا کہ 'بے شک میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔' لہٰذا دوسری مرتبہ **اھبطوا** کا حکم، آدم علیہ السلام کا زمین پر خلیفہ بنائے جانے کے لیے ہے کہ تمھیں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ بنایا جائے گا اور جب اللہ کی طرف سے ہدایت آئے گی تو اس کے مطابق تم کو عمل کرنا پڑے گا۔ بعض اہلِ علم کی رائے اس سے مختلف ہے۔ ان کے مطابق پہلا حکم ہبوط کا جنت سے زمین پر آنے کا تھا اور دوسری مرتبہ جو یہ حکم دیا گیا تو وہ زمین پر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کا تھا۔

'خوف' اور 'حزن' کا معنوی فرق

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول کرنے کے بعد اُنہیں فرمایا کہ میری بھیجی ہوئی ہدایت پر آئندہ عمل کرو گے تو تمہیں نہ خوف ہو گا اور نہ حزن۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے **فإما ياتينكم مني هدى فمن تبع هداي فلا خوف عليهم ولا هم يحزنون**[10] (پھر اگر میری طرف سے کوئی ہدایت تمہیں پہنچے تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے، ان کو نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ کسی غم میں مبتلا ہوں گے)۔ اس جگہ علمِ بیان کے لحاظ سے زیادہ بلیغ اور فصیح الفاظ استعمال ہوئے ہیں کیونکہ خوف کا تعلق مستقبل سے ہے اور حزن کا ماضی سے۔ اس طرح تاکید اور مبالغے کے ساتھ ثواب بتایا گیا۔ چنانچہ '**تفسیر بیضاوی**' میں ہے۔"فالخوف على المتوقع والحزن على الواقع نفى عنهم العقاب و أثبت لهم الثواب على آكد وجه و أبلغه."[11] خوف کا تعلق مستقبل سے اور حزن کا ماضی سے ہوتا ہے۔ اس میں ان کے لیے عذاب کی نفی اور ثواب کا اثبات ہے اور اس میں بڑی تاکید اور مبالغہ پایا جاتا ہے۔ علامہ بیضاوی نے عربیت کی رو سے **خوف** اور **حزن** کے الفاظ کا جو فرق ظاہر کیا ہے، اسے تمام اہلِ لغت تسلیم کرتے ہیں۔ ان الفاظ میں فصاحت و بلاغت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

۲) احوالِ ہود علیہ السلام

استعارے کا استعمال

قرآنی قصص میں حضرت ہود علیہ السلام کا واقعہ بھی ملتا ہے جنہیں قومِ عاد کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اُن کا واقعہ بعض سورتوں میں مجمل اور بعض میں مفصل بیان ہوا ہے لیکن ہر جگہ علمِ بیان کی بعض خصوصیات رکھتا ہے۔ سورۂ ہود میں ہے **إن ربي على صراط مستقيم**[12] (بے شک میرا رب سیدھی راہ پر ہے)۔ یہ استعارہ ہے۔ سیدھے راستے کو کامل انصاف کا استعارہ قرار دیا گیا ہے۔ اللہ کی ذات سیدھے راستے پر نہیں چلتی بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کامل انصاف کرنے والا ہے۔

کنائے کا استعمال

- قصۂ ھود علیہ السلام کی تصریف میں علمِ بیان کا ایک قاعدہ کنایہ بیان ہوا ہے۔ سورۃ ھود میں فرمایا گیا ہے **مامن دابة الاھو آخذ بناصیتہا**[13] (کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں ہو)۔ پیشانی کے بال پکڑنا تو اس میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت، تسلط اور قدرت کو کنائے کے اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ تمام مخلوق تو وہ اللہ عز و جل کے قبضے اور اختیار میں ہے۔ اللہ کو ان پر مکمل غلبہ اور تصرف حاصل ہے۔ مخلوق اس کے سامنے ایسے بے بس اور مجبور ہے جیسے کوئی شخص اپنے جانور کو پیشانی سے پکڑ کر چلاتا ہے اور وہ جانور اُس کے مطیع و منقاد ہوتا ہے۔ اہلِ عرب اس لفظ کو ذلت و مغلوبیت سے متصف قرار دیتے تھے۔ قومِ ھود کے بڑے بڑے جسم تھے تو ان کو ان کے نبی نے باور کرایا کہ بے شک تمھیں قوت و طاقت حاصل ہے مگر تم سب اللہ کی ذات کے سامنے ان جانداروں کی طرح ہو جن کی پیشانی کو اس نے پکڑ رکھا ہو اور وہ اس کی طاقت رکھتا ہے کہ جب چاہے تم کو ہلاک کر دے۔
- اس واقعے میں کنائے کی ایک اور مثال بھی پائی جاتی ہے۔ سورۂ ہود میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے **ولماجاء أمرنا**[14] (اور جب ہمارا حکم آ گیا)۔ یہ کہنے کی بجائے کہ ہمارا عذاب آیا، کہا گیا کہ ہمارا امر آ گیا۔ تو اس جگہ 'امر' کنایہ ہے عذاب سے۔

جملہ معترضہ

سورۃ فصلت میں فرمانِ الٰہیٰ ہے۔ **أولم یروا أن الله الذی خلقھم هو أشد منهم قوة**[15] (کیا وہ نہیں دیکھتے کہ بے شک اللہ تعالیٰ جس نے اُن کو پیدا کیا ہے وہ قوت میں اُن سے زیادہ بڑھ کر ہے۔)۔ یہ حضرت ہود علیہ السلام کے قصے میں بطور جملہ معترضہ لایا گیا ہے جو علمِ بیان میں کلام کی ایک خوبی ہے۔ اس جملے کو تاکید کے طور پر درمیان میں بیان کیا جاتا ہے جس کا تعلق اس واقعے سے نہیں ہوتا، لیکن اس میں اثنائے کلام کسی بات کی تاکید کے لیے جملہ معترضہ یا اعتراضیہ مستعمل ہوتا ہے جس سے بلاغت پیدا ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا آیت سے قبل قومِ ہود کا یہ دعویٰ مذکور تھا **من أشد منهم قوة** کہ ہم سے بڑھ کر طاقت میں اور کون ہے تو پہلے ان کے اس دعوے کی تردید میں اللہ تعالیٰ نے جملہ معترضہ کے طور پر فرمایا کہ تمہارا خالق تم سے زیادہ طاقتور ہے۔ قوم کی حالت اور ان کی بدکلامی پر تعجب کے لیے یہ جملہ معترضہ لایا گیا ہے۔

اسم فاعل کی بجائے اسم مبالغہ کا استعمال

بعض اوقات کسی کلام کے اندر عام لفظ لانے کی بجائے کوئی خاص لفظ لایا جاتا ہے جس میں زیادہ معانی پائے جاتے ہیں۔ گویا زیادہ فصیح و بلیغ لفظ لانا بھی علم بیان کی ایک بڑی خوبی تصور ہوتی ہے۔ قرآنی قصص میں بھی عام الفاظ کی بجائے نہایت فصیح و بلیغ الفاظ مستعمل ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت ہود علیہ السلام کے قصے میں آیا ہے۔ **ان ربی علی کل شئی حفیظ**[16] (بیشک میرا رب ہر چیز کا نگہبان ہے)۔ ادھر اللہ تعالیٰ کے لیے '**حافظ**' کی بجائے '**حفیظ**' کا زیادہ فصیح لفظ استعمال ہوا ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ابن عاشور نے اس لفظ کی فصاحت و بلاغت کو نمایاں کیا ہے۔ '**التحریر و التنویر**' کے مصنف اسی قصے کے تحت لفظ حفیظ کی بحث میں رقم طراز ہیں کہ "و الحفیظ: أصله مبالغة الحافظ، و هو الذي یضع المحفوظ بحیث لا یناله أحد غیر حافظه."[17] حفیظ تو یہ حافظ سے مبالغہ ہے۔ اس کے معنی ایسے شخص کے ہیں جو اپنی کوئی شے ایسے محفوظ جگہ رکھتا ہے جہاں اُس کے سوا کوئی اور اسے اٹھا نہ سکتا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ عربی زبان میں **حافظ** بروزنِ فاعل اور **حفیظ** بروزنِ فعیل کے معنوں میں فرق پایا جاتا ہے۔ ایک ہی مادے سے ان دونوں اوزان پر لائے ہوئے الفاظ مختلف معانی پیدا کرتے

ہیں۔ اسم فاعل سے زیادہ اسم مبالغہ میں معنی کی کثرت پائی جاتی ہے جیسا کہ حفیظ کے لفظ میں ہے۔ قرآن میں بعض مقام پر اسم فاعل بجائے اسم مبالغہ کا استعمال کیا گیا ہے جو اس کی غیر معمولی فصاحت و بلاغت ہے۔

مجاز مرسل

کلام کی ایک خوبی یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں کوئی لفظ مجاز مرسل کے طور پر استعمال ہو۔ یہ اعلیٰ بلاغت کہلاتی ہے۔ اس میں کسی شے کے سبب کو اُس کے مسبب کی جگہ لایا جاتا ہے۔ قرآن میں اس کی بکثرت مثالیں موجود ہیں جیسے قصہ ٔہود علیہ السلام میں وارد ہوا ہے۔**یرسل السماء علیکم مدرارا**[18](وہ تم پر خوب بارشیں برسائے گا)۔اس آیت میں '**السماء**'(بادل) کو **مدرارا** (بارش برسانے والا) کہا گیا ہے اور یہ مجاز مرسل کی مثال ہے جسے '**التفسیر المنیر**' نے اس طرح نمایاں کیا ہے۔"یرسل السماء علیکم مدرارا عبر بالسماء عن المطر من قبیل المجاز المرسل، لنزوله من السماء، و مدرار: للمبالغة."[19]
یرسل السماء علیکم مدرارا(وہ تم پر خوب بارشیں برسائے گا)اس جگہ بادل کو بارش کہا گیا ہے۔ یہ مجاز مرسل ہے کیونکہ اسی سے بارش ہوتی ہے۔ لفظ '**مدرارا**' میں مبالغہ پایا جاتا ہے۔

تقدیم و تاخیر

بعض اوقات کسی کلام میں تقدیم و تاخیر کر دی جاتی ہے جس کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اس سے کسی بات پر زور، حصر یا تاکید پیدا ہو جاتی ہے اور متکلم کے کلام کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ سورۃ ھود میں حضرت ہود علیہ السلام کے واقعے میں توبہ سے پہلے استغفار کا ذکر ہے جیسا کہ فرمایا گیا۔**و یا قوم استغفروا ربکم ثم یتوبوا الیه**[20](اے میری قوم! اپنے رب سے گناہوں کی معافی مانگو اور توبہ کرو)۔ اس آیت میں توبہ سے پہلے استغفار کا ذکر اس لیے ہے کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب تک کوئی شخص اپنے گناہ کا اعتراف نہ کرلے اُس کی توبہ ممکن نہیں ہوتی۔

حرف 'الا' کا تکرار

تکرار کو علمِ معانی میں عام طور پر کلام کا عیب سمجھا جاتا ہے، لیکن بعض اوقات یہی تکرار کلام کی خوبی ہو جاتی ہے جہاں اس سے مقصود تاکید یا مبالغہ ہو۔ چنانچہ حضرت ہود علیہ السلام کے قصے میں سورۃ ہود میں 'اَلَا' کے لفظ کی تکرار ہے۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔**الا ان عادا کفروا ربهم الا بعدا لعاد قوم هود**[21](خبردار بیشک قومِ عاد نے اپنے رب کا انکار کیا، خبردار! ہود کی قوم عاد کے لئے بربادی ہے)۔ اس مقام پر حرفِ تنبیہ، **الا** لفظ کا اعادہ انتہائی تاکید پر دلالت کرتا ہے اور اس کے لانے کا مقصد دہشت اور خوف میں مبالغہ پیدا کرنا ہے۔ لہٰذا یہ تصریف کلام کی خوبی ہے۔

کسی بات کے سبب کو موخر بیان کرنا

بعض اوقات کسی بات کا سبب پہلے بیان کرنے کی بجائے بعد میں بیان کیا جاتا ہے تاکہ قصے کا تسلسل بھی رہے اور اس سے حاصل ہونے والا نتیجہ یا سبق بھی پیش نظر رہے۔ چنانچہ حضرت ھود علیہ السلام کے قصے کی تصریف میں سورۃ ہود میں پہلے اُس قوم کی ہلاکت کا ذکر کیا اور بعد میں اُن پر بددعا کی گئی کہ ہلاک ہونے والے اسی بددعا کے مستحق تھے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے و **اتبعوا فی هذه الدنیا لعنة و یوم القیامة الا ان عاد کفروا ربهم الا بعدا لعاد قوم هود**[22](ان کے پیچھے اس

دنیا میں بھی لعنت لگی اور قیامت کے دن بھی۔ آگاہ رہ، قومِ عاد نے اپنے رب کا انکار کیا۔ سنو، ہلاکت ہے یہود کی قوم، عاد کے لیے) اسی قاعدے کی وضاحت میں علامہ زمخشری نے اپنی تفسیر 'الکشاف' میں رقم طراز ہیں۔

"فإن قلت: بُعداً دعاء بالهلاك، فما معنى الدعاء به عليهم بعد هلاكهم؟ قلت: معناه الدلالة على أنهم كانوا مستأهلين له."[23]

اگر تم کہو کہ **بُعْدًا** تو ہلاکت کی بد دعا ہے تو یہ ان لوگوں کی ہلاکت کے بعد کیوں کی گئی ہے؟ تو میں اس کے جواب میں یہ کہوں گا کہ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ لوگ اسی ہلاکت کے اہل تھے۔

گویا تسلسل قائم رکھنے کے لیے قومِ عاد پر لعنت اور عذاب کا ذکر پہلے کیا گیا اور اس کے سبب کفر کو بعد میں بیان کیا گیا۔

'نجینا' کے لفظ کا تکرار

سورۃ ھود میں اللہ عزوجل کا فرمان ہے۔**ولما جاء أمرنا نجينا هوداً والذين آمنوا معه برحمة منا و نجيناهم من عذاب غليظ**[24] (اور جب ہمارا حکم آیا، ہم نے ہود کو اور جو اس کی قوم اس کے ساتھ ایمان لائے اپنی رحمت سے بچالیا، اور ہم نے انہیں بچالیا سخت عذاب سے)۔ یہاں نجینا کے لفظ کا تکرار پایا جاتا ہے لیکن اسے تکرارِ محض سمجھنا سطح بینی ہے۔ پہلے لفظ نجینا سے یہ واضح کر دیا گیا کہ حضرت ھود علیہ السلام اور اہلِ ایمان کو عذاب کی جگہ سے الگ کر لیا گیا تھا اور پھر دوسری مرتبہ اس لفظ کو لا کر یہ بتایا گیا کہ جب دوسروں پر عذاب آیا تو اس وقت ان لوگوں کو ان نافرمان لوگوں کے برے انجام سے بچالیا گیا تھا۔ اس میں اللہ سبحانہ کی رحمت کا ظہور زیادہ ہے۔

۳) واقعۂ صالح علیہ السلام

"فاتقوا اللہ و أطیعون" کا اعادہ

قرآنی قصص میں حضرت صالح علیہ السلام اور اُن کی قوم ثمود کے قصے کا ذکر بھی آتا ہے جس میں علم بیان کے کئی محاسن پائے جاتے ہیں۔ ایک جگہ حضرت صالح علیہ السلام نے تقویٰ اختیار کرنے اور اطاعت کرنے کا دوبارہ حکم دیا ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے ۔**فاتقوا الله و أطيعون**[25] (پس تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو)۔ اس حکم کو تکرار کے ساتھ بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ رسالت اور دعوت و تبلیغ کے لیے یہی دو چیزیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں تاکہ لوگ ان کی پابندی کر کے ہدایت اور فلاح پائیں۔ ہر نبی نے دعوت کا آغاز تقوے سے کیا ہے کیونکہ اطاعت اسی وقت ہو سکتی ہے جب یہ صفت انسان میں ہو۔ لہٰذا انبیاء اپنی قوموں کو اس کا حکم تاکید کے ساتھ دیتے رہے۔

کسی چیز کو اللہ کی طرف منسوب کرنا

بعض اوقات ایک چیز عام ہوتی ہے لیکن جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ یا اور کسی بڑی چیز کی طرف کر دی جائے تو اس میں عظمت پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ حضرت صالح علیہ السلام کے واقعے میں اونٹنی کی نسبت اللہ سبحانہ کی طرف کرتے ہوئے **ناقۃ اللہ**[26] فرمایا گیا۔ یہ اضافت تخصیص اور فضیلت کے لیے ہے جیسا '**بیت اللہ**' کہا جاتا ہے۔ جہنم کی آگ کو '**نار الله موقدة**' کہا گیا یعنی اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ۔ اس میں آگ کو اللہ کی طرف منسوب کر کے اس کی حرارت کی شدت اور ہولناکی کو کثرت کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے۔ اسی طرح مساجد اللہ کی تعظیم کی وجہ سے ان کی اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کی گئی ہے۔

کسی شے کی تحقیر کے لیے اسم نکرہ کا استعمال

حضرت صالح علیہ السلام اور اُن کی قوم کے قصے میں علمِ بیان کا ایک یہ قاعدہ بھی بیان ہوا ہے کہ کسی شے کی تحقیر اور قلت کو ظاہر کرنے کے لیے اسم نکرہ استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ اسی قصے میں '**ولا تمسوھا بسُوٓءٍ**[27] (اور اس کو برائی کے ارادے سے چھونا بھی نہیں) کے الفاظ آئے ہیں۔ یہاں **السوء** کی بجائے **بسوء** کا لفظ لوگوں کو اونٹنی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے سے باز رکھنے کے لیے آیا ہے۔ **ولا تمسوھا بسوء** میں سوء کی تنکیر قلت اور حقارت کے لیے ہے۔ یعنی اُسے ذرا بھی تکلیف نہ پہنچانا۔

جمع سے واحد مراد لینا

اسی قصے کی تصریف میں سورۃ القمر میں ہے۔ **کذبت ثمود بالنذر**[28] (قومِ ثمود نے خبر دار کرنے والوں کو جھٹلایا)۔ قبیلہ ثمود حضرت صالح علیہ السلام کی قوم تھی۔ انہوں نے صرف ایک رسول حضرت صالح علیہ السلام کو جھٹلایا لیکن قرآن میں آیا ہے کہ انہوں نے تمام رسولوں کو جھٹلایا۔ یہاں **نذیر** کے لفظ کی جگہ **نذر** جمع کا لفظ آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سجع و فواصل کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ دوسرا اس میں جمع کہ کر واحد مراد لینے کا اسلوب بھی پایا جاتا ہے تا کہ واضح ہو جائے کہ ایک رسول کی تکذیب سب رسولوں کی تکذیب کے مساوی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام رسولوں کی تعلیم، دعوت اور اصولِ دین ایک ہی ہوتے ہیں۔ وہ تمام توحید، فرشتوں، رسولوں، کتابوں اور روزِ قیامت پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس لیے قرآن نے ایک رسول کے انکار کو تمام رسولوں کے انکار سے تعبیر کیا۔

استعارے کا استعمال

حضرت صالح علیہ السلام اور اُن کی قوم کے قصے میں علمِ بیان کا ایک پہلو یہ بھی مذکور ہوا ہے جسے استعارہ تمثیلیہ کہا جاتا ہے۔ سورۃ القمر میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ **ففتحنا أبواب السماء**[29] (پھر ہم نے آسمان کے دروازے موسلا دھار بارش سے کھول دیے)۔ اس آیت میں بادلوں سے بارش برسنے کو استعارے کے اسلوب میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ جیسے آسمان کے دروازے کھول کر نہریں جاری کی گئی ہوں۔ اس استعارے کی وضاحت تفسیر '**صفوة التفاسیر**' میں اس طرح کی گئی ہے۔"الاستعارة التمثيلية ففتحنا أبواب السماء (القمر:١١) شبه تدفق المطر من السحاب بانصباب أنهار انفتحت بها أبواب السماء."[30] **ففتحنا أبواب السماء** (پھر ہم نے آسمان کے دروازے موسلا دھار بارش سے کھول دیے) میں استعارہ تمثیلیہ ہے۔ بادلوں سے بارش کے اُچھلنے کو آسمان کے دروازوں سے نہریں بہانے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

'الا'، حرفِ تنبیہ کا اعادہ

سورۃ ھود میں علمِ بیان کے اعتبار سے '**الا**' کا حرف دوبار لایا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ **كأن لم يغنوا فيها ألا إن ثمود كفروا ربهم ألا بعدا لثمود**[31]۔ اس میں تاکید کا فائدہ یہ ہوا ہے کہ اس طرح اُس قومِ ثمود پر اللہ کی لعنت پر زور دیا گیا ہے۔ ان کو کفر و شرک، اللہ کی نعمتوں کی ناشکری اور ضد و عناد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور کر دیا گیا۔

'دار' اور 'دیار' کا فرق

حضرت صالح علیہ السلام اور اُن کی قوم کے قصے میں سورۃ الاعراف میں مذکور ہے۔ **فأصبحوا في دارهم جاثمين**[32] (وہ اپنے شہروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے)۔ سورۃ ھود میں فرمانِ الہٰی ہے۔ **فأصبحوا في ديارهم جاثمين**[33] (وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے) سورۃ الاعراف میں '**دارھم**' آیا ہے جبکہ دوسری جگہ '**دیارھم**' کے الفاظ آئے ہیں۔ علم بیان کے اعتبار سے ان میں یہ معنویت پائی جاتی ہے کہ '**دارھم**' سے مراد 'اُن کا شہر' ہے اور '**دیارھم**' سے اُن کے مکانات مراد ہیں۔ اسی معنوی فرق کو **تفسیر الماوردی** میں اس طرح ظاہر کیا گیا ہے۔"(فأصبحوا في دارهم جاثمين) قال محمد بن مروان السدي: كل ما في القرآن من (دارهم) فالمراد به مدينتهم، و كل ما فيه من (ديارهم) فالمراد به مساكنهم."[34] **فأصبحوا في دارھم جاثمین** (وہ اپنے شہروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے) محمد بن مروان سدیؒ کا قول ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں **دارھم** کا لفظ آیا ہے تو اس سے شہر مراد ہے اور جہاں **دیارھم** آیا ہے تو اس سے مراد اُن کے گھر ہیں۔ لہٰذا جہاں پر بستی کی تباہی کا ذکر ہے وہاں **دار** کا لفظ آیا اور جس مقام پر گھروں کی تباہی کو بیان کیا گیا ہے تو وہاں **دیار** کا لفظ آیا ہے۔

عذابِ الٰہی کے بیان میں مختلف الفاظ کا استعمال

قومِ ثمود پر نازل ہونے والے عذاب کو تصریف کے انداز میں کہیں '**صاعقة**'[35] کہیں **صيحة**،[36] کہیں **رجفة**[37] اور کہیں **الطاغية**[38] سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ظاہر بین نگاہیں یہ تصور کر لیتی ہیں کہ اس مضمون میں تکرار و تضاد ہے حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے کیونکہ جب ان میں سے ہر حالت اور کیفیت کو اس کے جدا جدا وقت اور مقام کے لحاظ سے سمجھنے کی کوشش کی جائے گی تو مذکورہ اشکال فوراً رفع ہو جائے گا۔ یہ علم بیان کی وہ خوبی ہے جس میں کسی واقعے کے مختلف مراحل کو الگ الگ الفاظ سے بیان کیا جاتا ہے تاکہ اس واقعے کی پوری تفصیل سامنے آ جائے۔ اسی حقیقت کی وضاحت میں '**تفسیر مراغی**' میں مرقوم ہے کہ

> **"(فأما ثمود فأهلكوا باطاغية) أي فأما ثمود فأهلكهم الله بصيحة جاوزت الحد فى الشدة كما جاء فى هود "و أخذ الذين ظلموا الصيحة" و هي الصاعقة التي جاءت فى حم السجدة، والرجفة والزلزلة التي جاءت فى سورة الأعراف، فلا تعارض بين الآيات، لأن الهلاک فى بعضها نسب إلى السبب القريب، و فى بعضها نسب إلى السبب البعيد."**[39] **فأما ثمود فأهلكوا باطاغية** یعنی قوم ثمود جسے اللہ تعالیٰ نے '**صیحة**' شدت میں حد سے تجاوز کرنے والی آواز کے ذریعے ہلاک کیا تھا جیسے سورہ ھود میں آیا ہے: **و أخذ الذين ظلموا الصيحة** (اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا اُن کو آواز نے آ پکڑا) اور وہ چنگھاڑ تھی جس کا ذکر سورہ حم السجدہ میں آیا۔ اور **رجفه** سے مراد زلزلہ ہے جس کا ذکر سورۃ اعراف میں آیا ہے۔ چنانچہ ان آیات میں تعارض نہیں ہے اس لیے کہ ہلاکت کی نسبت بعض قریب کے سبب کی طرف کی گئی ہے اور بعض میں اُس کی نسبت دور کے سبب کی طرف کی گئی ہے۔

قومِ ثمود پر جب عذاب آیا تو پہلے سخت گرجدار آواز آئی جو کہ آسمانی بجلی کا نتیجہ تھی۔ اس زوردار آواز سے ہر شے دہل گئی، زمین میں ارتعاش پیدا ہوا جس کے نتیجے میں وہ نافرمان لوگ مارے گئے۔ ان الفاظ میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ جب کوئی

دھماکہ ہوتا ہے تو زمین بھی اس کے نتیجے میں کانپ اٹھتی ہے۔ گویا پہلے چنگھاڑ تھی جس نے بعد میں زلزلے کی شکل اختیار کر لی اور یہ عذاب اتنا سخت تھا کہ وہ صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ گویا صاعقة سے مراد کڑک، صیحة سے مراد زور دار آواز یعنی دھماکہ، رجفة سے مراد زلزلہ اور طاغیة سے مراد منہ زور عذاب ہے۔ اگرچہ اس قصے میں عذابِ الٰہی کے لیے مختلف الفاظ استعمال ہوئے ہیں لیکن مقصود ان سب سے عذاب ہے جو اس قوم پر آئے تھے۔

'عذاب قریب'، 'الیم' اور 'عظیم' کا فرق

قومِ ثمود کے اسی قصے میں اُس قوم پر عذاب آنے کو سورۃ الاعراف میں فیأخذکم عذاب الیم 40 (دردناک عذاب)، سورۃ ھود (آیت:٦٤) میں فیأخذکم عذاب قریب 41 (جلد آنے والا عذاب) اور سورۃ الشعراء میں فیأخذکم عذاب یوم عظیم 42 (بڑا عذاب) کہا گیا ہے۔ بظاہر یہ تضاد نظر آتا ہے لیکن ان تینوں باتوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ دردناک اور بڑے عذاب کا قریب ہونا، اس کے منافی نہیں ہے۔ سورۂ ھود میں اسے قریب کہا گیا کیونکہ اس سے پہلے 'تمتعوا فی دارکم ثلاثة ایام' آیا ہے جس کی مناسبت سے قریب کا لفظ آیا۔ اس مدت کے بعد ان پر عذاب آنا تھا جس کا ان سے وعدہ کیا جا چکا تھا۔ اسی طرح سورۂ الشعراء میں اسی عذاب کو عظیم کہا گیا کیونکہ ان الفاظ سے دن کی ہولناکی ظاہر کی گئی ہے جو کہ عذاب کی صفت ہے۔ عذاب کے قریب، الیم اور عظیم میں کوئی منافات نہیں ہے۔ یہ عذاب کی مختلف تعبیرات ہیں۔

خلاصۂ بحث

حاصلِ کلام یہ ہے کہ قرآنی قصص میں علمِ بیان کے کئی امور زیرِ بحث لائے گئے ہیں جن سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ قرآن نے نہ صرف عام آیات میں بلکہ قصص کی آیات میں بھی علمِ بیان کے محاسن سے اپنے ابلاغ کا کام لیا ہے۔ اس نے کئی جگہوں پر ایسے بلیغ الفاظ استعمال کیے ہیں جو اپنے دامن میں معانی کے مختلف پہلوؤں کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ ایسے حروف و ادوات کا ذکر کیا ہے جن سے وہ اپنے مضامین کو نہایت پرزور اور موثر طریقے سے بیان کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے بیان و معانی کے کئی امور کو بڑی کامیابی کے ساتھ نبھایا ہے۔ استعارہ، کنایہ، مبالغہ، مجاز مرسل، تقدیم و تاخیر وغیرہ جیسے متنوع اسالیب کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ برتا ہے۔ ہر لفظ کو موقع و محل کی مناسبت سے لایا گیا ہے۔ اس سے قرآن کی فصاحت و بلاغت عیاں ہوتی ہے اور اس طرح قرآن کا اعجازی پہلو اس کے قصص میں بھی بہت نمایاں نظر آتا ہے۔

حوالاجات

[1] عبد الرحمٰن بن حسن حبنكة الميداني، **البلاغة العربية**، (دمشق، دار القلم، 1416ھ)، 2/126.
[2] الحجر ١٥:٣٠
[3] الاعراف ٧:١٢-١٣
[4] الحجر ١٥:٣٢-٣٥
[5] البقرۃ ٢:٣٥
[6] الاعراف ٧:١٩
[7] محمد عبد النعيم القيعي رحمہ اللہ، د، **الأصلان فی علوم القرآن**، (حقوق الطبع محفوظة للمؤلف، ١٤١٧ھ)، ص:٦٧۔
[8] البقرۃ ٢:٣٦

[9] البقرۃ ۳۶:۲

[10] البقرہ ۳۸:۲

[11] بیضاوی، ناصر الدین ابو سعید عبد اللہ، **انوار التنزیل واسرار التأویل**، (بیروت، داراحیاء التراث العربی، ۱۴۱۸ھ)، ج:۱، ص: ۴۷۔

[12] ھود ۵۶:۱۱

[13] ھود ۵۶:۱۱

[14] ھود ۵۸:۱۱

[15] فصلت ۱۵:۴۱

[16] ھود ۵۷:۱۱

[17] ابن عاشور، محمد طاہر، **التحریر والتنویر**، (بیروت، مؤسسۃ التاریخ، ۱۹۸۴ء)، ج:۱۲، ص:۱۰۳۔

[18] ھود ۵۲:۱۱

[19] زحیلی، وھبۃ بن مصطفٰی، د، **التفسیر المنیر فی العقیدۃ والشریعۃ والمنہج**، (دمشق: دارالفکر، ۱۴۱۸ھ،) ج:۱۲، ص:۸۷۔

[20] ھود ۵۲:۱۱

[21] ھود ۶۰:۱۱

[22] ھود ۶۰:۱۱

[23] زمخشری، ابو القاسم محمود بن عمرو، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل، (البیروت، اراالکتاب العربي، ۱۴۵۷ھ)، ج:۲، ص:۴۰۵۔

[24] ھود ۵۸:۱۱

[25] الشعراء ۲۶:۱۴۴، ۱۵۰

[26] الاعراف ۷:۷۳، ھود ۱۱:۶۳، الشمس ۹۱:۱۳

[27] الاعراف۷:۷۳

[28] القمر۵۴:۲۳

[29] القمر۵۴:۱۱

[30] محمد علی الصابونی، **صفوۃ التفاسیر** ،(بیروت، دار القرآن الکریم،۱۹۱۸ء)،ج:۳، ص:۲۷۲۔

[31] ھود۱۱:۶۸

[32] الاعراف۷:۷۸

[33] ھود۱۱:۶۷

[34] الماوردی، علی بن محمد، **النکت والعیون**،(بیروت، دار الکتب العلمیۃ)،ج:۲، ص:۲۳۶۔

[35] فصلت۴۱:۱۷

[36] ھود۱۱:۷، القمر۵۴:۳۱

[37] الاعراف۷:۷۸

[38] الحاقۃ۶۹:۵

[39] مراغی، احمد بن مصطفٰی، **تفسیر المراغی**،(**مصر، شرکت مکتبۃ مصطفی البابی الحبلی واولادہ،۱۳۶۵ھ،**)ج:۲۹، ص:۵۱-۵۲۔

[40] الاعراف۷:۷۳

[41] ھود۱۱:۶۴

[42] الشعراء۲۶:۱۵۶